

میرزاخان داغ دہلوی (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ و تراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
نامہ بر	قاصد، خط لے جانے والا
اجل	موت
عدو	دشمن
نہیں کھیل	کوئی کھیل نہیں، کوئی آسان کام نہیں
گو	اگرچہ
خاطر	لحاظ، پاسداری
چمن	باغ
تاب و تواں	طاقت، حوصلہ، صبر و تحمل
آشیاں	گھونسلے
عنان	ویران
افشائے راز	راز ظاہر ہو جانا

(بورڈ 2008)

شعر نمبر 1:

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو، کہاں آتے آتے

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غم جاناں اور غم دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیر تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ”محبوب میری طرف آتے آتے راستہ بدل گیا۔ اے موت تو کہاں مر گئی ہے تو ہی آ جا۔“ انسانی فطرت ہے کہ انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے اسے اپنی نظروں کے سامنے موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ جوں جوں وابستگی بڑھتی ہے اسی اعتبار سے دیکھتے رہنے کی خواہش بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر محبوب نظروں کے سامنے موجود نہ ہو تو انسان انتظار کرتا ہے خاص طور پر جب محبوب عاشق سے ملاقات کا وعدہ کرتا ہے تو عاشق رات بھر محبوب سے ملاقات کے مقررہ وقت کا بڑی بے چینی، بے قراری اور شدت سے قیامت خیز انتظار کرتا رہتا ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

داغ کی شاعری میں محبوب کو طعن و تشنیع اور اس کی وعدہ خلافیوں کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ محبوب عام طور پر عاشق سے ملاقات کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن عین وقت پر وہ وعدہ خلافی کر جاتا ہے۔ محبوب کے سارے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں اور وہ کوئی وعدہ وفا نہیں کرتا۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

نہ کیا وعدہ رات کا پورا
تو نہیں اپنی بات کا پورا

میرزا داغ دہلوی کا موقف یہ ہے کہ محبوب ہماری طرف آتے ہوئے راستے سے واپس چلا گیا اور ہم تنہا رہ گئے ہیں۔ ہماری بے چینی اور بے قراری میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ جینا محال ہو گیا ہے۔ کاش تنہائی کے اس عالم میں جب میدان خالی ہے تو موت ہی آ جاتی۔ محبوب کو روکنے والے تو بہت تھے۔ وہ خود بھی محبت کرنے والوں پر سختی کرتا ہے لیکن موت کو تو روکنے والا کوئی نہیں تھا کاش ایسے میں موت ہی آ جاتی۔ آتش کا کہنا ہے:

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

بٹھا رکھا ہے اُس نا مہرباں نے منتظر کر کے
خدا سے ہے مجھے اُمید اٹھا لے مہرباں ہو کر

داغ موت سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اے موت تو کہاں مر گئی ہے۔ آج تنہائی کے اس عالم میں جب بے چینی و بے تابی حد سے تجاوز کر گئی ہے تو موت بھی نہیں آرہی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ایک طرف تو محبوب بھی نہیں آ رہا اور دوسری طرف موت بھی نہیں آرہی۔ ہماری بے چینی اور بے قراری کے خاتمے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ محبوب آ جائے یا ہم دنیا سے چلے جائیں مگر افسوس کہ نہ تو محبوب آ رہا ہے اور نہ ہم (دُنیا سے) جا رہے ہیں۔ عدم کا کہنا ہے:

قیامت کا بازار کیا گرم ہوگا
نہ ہم جا رہے ہیں نہ تم آ رہے ہو

شعر نمبر 2:

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غم جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ زیر تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ”میرے مہربان! تم نے آنے میں تاخیر کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اس دوران میں کوئی دنیا سے

چلا جائے گا۔“

وقت گزر جانے کے بعد کسی کے کام آنے کی کوشش کرنا بے کار ہوتا ہے۔ کسی بھی فرد کی، اس کے فیصلے کی، اس کے رویے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا انحصار وقت اور زمانے کے اعتبار سے ہوتا ہے جب کسی شے کی ضرورت ہو اور وہ میسر نہ ہو تو انسان اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، دعا کرتا ہے، انتظار کرتا ہے جب وہ ضرورت ختم ہو جائے تو پھر مطلوبہ شے کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی جب تک ہو اسی وقت تک چیزوں کی اہمیت بھی اس کے لیے ہوتی ہے جب زندگی ہی نہ رہے تو پھر ہر شے بے معنی ہو جاتی ہے۔ میرزا داغ دہلوی کا موقف یہ ہے کہ محبوب ہماری جاں نکلنے کے بعد آ تو گیا ہے لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ جتنی تاخیر میں کر رہا ہوں اس میں کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔ لہذا جان جانے کے بعد محبوب کا آنا بے معنی و بے سود ہے۔ غالب کا کہنا ہے:

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمیاں کا پشیمیاں ہونا

عاشق زندگی بھر محبوب کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اُسے عشق و محبت میں کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشق و محبت کی تکالیف اور پریشانیاں جھیلنے جھیلنے جب وہ دنیا سے چلا جاتا ہے تو محبوب کو اُس کی موت پر افسوس، ندامت اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ یعنی زندگی بھر تو محبوب عاشق کے پاس آتا نہیں لیکن موت کے وقت ندامت اُسے کھینچ لاتی ہے۔ مگر اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

مر چلے ہم، تو رحم کرنے لگے
اب جو کرتے ہو، پیشتر نہ کیا

حسرت موبانی کا کہنا ہے:

وہ آئے مگر آئے کس وقت حسرت
کہ ہم چل بے مرجبا کہتے کہتے

داغ کا موقف یہ ہے کہ محبوب مہربان تو ہوا لیکن اتنی تاخیر سے کہ ہم دنیا میں نہ رہے۔ اس میں ایک طرح کا طنز ہے کہ ایسی مہربانی کس کام کی جو انسان کی زندگی میں نہ ہو بلکہ مرنے کے بعد ہو۔ محبت کرنے والے عام طور پر محبوب کے مہربان ہونے کی خواہش لیے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ داغ کے یہاں محبت کرنے والے کی طرف سے محبت کی لاپرواہی کا احساس بھی ملتا ہے کہ محبوب کو یہ خیال ہی نہیں کہ اس کی تاخیر کے باعث کوئی دنیا سے چلا جائے گا۔ یا یوں کہیے کہ محبوب کو اس بات کی پروا نہیں کہ اس کی بے رخی سے کوئی جیتا ہے یا مرتا ہے اور موت کے بعد محبوب کو اس بات پر پشیمانی ہوتی ہے۔ مگر جب تک عاشق زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

وہ آئے ہیں پشیمیاں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

داغ کا موقف یہ ہے کہ عاشق کو زندگی بھر محبوب سے ملاقات کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن جب وہ بالآخر اس جہان سے چلا جاتا ہے تو پھر محبوب ندامت و پشیمانی کے ساتھ عاشق کی قبر پر آتا ہے۔ لیکن موت کے بعد محبوب کا آنا بے سود ہوتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے:

مرنے کے بعد آئے وہ مرے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

شعر نمبر 3:

سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غم جاناں اور غم دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیر تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ”محبوب سے ملاقات کے وقت جو بات اُسے سنانے کے قابل تھی وہ درمیان میں ہی رہ گئی۔“ انسان بعض اوقات غیر ضروری باتیں تو کرتا رہتا ہے لیکن جو بات کرنا چاہتا ہے وہ لفظوں کا روپ نہیں دھاڑ سکتی۔ اظہار کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے جن کا ذکر سورۃ الرحمن میں کرتا ہے۔ ”اُس نے انسان کو بیان سکھایا“۔ بعض اوقات انسان بہت سی باتیں کہہ نہیں پاتا، اس لیے کہ کہیں ان کا غلط مطلب نہ لیا جائے۔ چنانچہ داغ کے معاملہ بندی کے اس شعر میں بھی ایسی ہی صورت حال کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ محبوب سے ملاقات سے قبل تو محبوب سے دل کی بات کرنے کی خواہش تھی۔ لیکن محبوب سے ملاقات کے وقت اُس سے دل کی بات نہیں ہو سکی۔ میر کا کہنا ہے:

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے، جو وہ آتا

یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

عاشق محبوب کے سامنے اپنے دل کی بات کئی وجوہات کی بنا پر نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عاشق محبوب کو دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور اس کے حسن و جمال میں کچھ اس طرح ڈوب جاتا ہے کہ اُسے کوئی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ میر کا کہنا ہے:

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن

جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

ایک اور بڑی وجہ جس بنا پر عاشق اپنے محبوب سے دل کی بات نہیں کر پاتا یہ ہے کہ اُسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں محبوب انکار نہ کر دے اور محبوب سے تعلقات بالکل ہی منقطع نہ ہو جائیں۔ اسی طرح ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دورانِ ملاقات محبوب عاشق سے گلے شکوے اور شکایتیں شروع کر دیتا ہے اور عاشق کو اپنے دل کی بات کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ دراصل انسان اپنے دل کی بات بتانے کے لیے کسی موزوں وقت اور موقع کی تلاش میں ہوتا ہے۔ لیکن دورانِ ملاقات محبوب کے شکوہ و شکایت کی وجہ سے عاشق کو اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لاسکے اور عاشق کے دل کی بات درمیان میں ہی رہ جاتی ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

شکایت حکایت ہی میں رات گزری

رہے تذکرے درمیاں کیسے کیسے

اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

جراتِ عرضِ حال کیا ہوتی

نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں

انسانی فطرت یہ ہے کہ جو بات جتنی ضروری ہو اس کے اظہار میں انسان اتنی ہی عجلت کرتا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو ضروری بات کہہ دی

جائے لیکن محبت کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں کہ انسان ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں تو کرتا رہتا ہے لیکن اصل بات کہنے سے ہچکچاتا رہتا ہے۔ داغ کا موقف یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان بات چیت نہ ہوتی ہو۔ باتیں تو ہوں گی لیکن جو بات اسے بتانا ضروری تھا وہ نہیں بتائی جاسکی۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

شعر نمبر 4:

میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غم جاناں اور غم دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملات محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیر تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ”آندھیوں کی زد میں آ کر فقط میرا بسیرا ہی تباہ نہیں ہوا، پورے کا پورا بابا جڑ گیا ہے۔“

انسان بیک وقت دو سطحوں پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک اس کی ذاتی زندگی اور دوسری اجتماعی زندگی۔ بعض معاملات اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایک فرد کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جس کا رد عمل اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن سماجی زندگی گزارتے ہوئے انسان اجتماعی صورت حال سے لائق نہیں رہ سکتا چنانچہ معاشرے میں انسان کے ارد گرد ہونے والے واقعات انسان کی نجی زندگی کو بھی اثر انداز کرتے ہیں۔ میرزا خان داغ بھی اپنی تباہی اور بربادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا آشیانہ آندھیوں کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا ہے۔

آشاؤں کے تنکے چن چن کے سپنوں کا محل سجایا تھا
طوفان سے تنکے بکھر گئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

امیر مینائی کا کہنا ہے:

جب سے بلبل تُو نے دو تنکے کیے
ٹوٹی ہیں بجلیاں ان کے لیے

داغ کی زندگی کے ابتدائی ایام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی میں کچھ صدمات ایسے آئے جو اس وقت کے معاشرے کو اجتماعی سطح پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے اور یہ ۱۸۵۷ء کے حالات تھے کہ جب دہلی پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو داغ کے والد کو ایک انگریز کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ نو عمری ہی میں داغ یتیم ہوئے اور ان کا گھر اجڑ گیا دوسری طرف دہلی شہر دار الحکومت ہونے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ انگریز دور میں بے شمار لوگوں کو سزائے موت ہوئی لوگوں کے گھر گرا دیے گئے، انھیں جیل بھیج دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ یعنی ایک طرف تو داغ کی ذاتی زندگی تباہی کا شکار تھی اور دوسری طرف اجتماعی زندگی بھی انگریز کے مظالم کی وجہ سے بد حال ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ داغ کا موقف یہ ہے کہ مجھے اپنی تباہی سے زیادہ ملک کی تباہی کا رنج اور دکھ ہے۔ اقبالؒ کا کہنا ہے:

میرا رونا نہیں، رونا ہے یہ گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں مری

داغ کا موقف بھی یہی ہے کہ میرا گھر تو چند تنکوں پر مشتمل تھا۔ آندھی و طوفان کے سامنے زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تھا گویا اس نے تو برباد ہونا ہی تھا لیکن طوفان سے باغ بھی نہ بچ سکا یعنی اجتماعی حالات اس طرح بگڑے کہ ہر شے تہ و بالا ہو گئی۔ درحقیقت اس شعر میں ”چمن“ ملک کے لیے استعارہ ہے اور اسی طرح ”آندھیاں“ انگریز کے مظالم کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی انگریز کے مظالم سے تو میرے گھر کے ساتھ ساتھ پورا ملک بھی تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے مجھے اپنے گھر سے زیادہ ملک کی تباہی کا افسوس ہے۔ اکبر الہ آبادی نے یہی مضمون اسی انداز میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں! میرا نشین تھا کہاں؟
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں؟

شعر نمبر 5:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مفہوم:

اردو زبان سیکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اس کے لیے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔

☆☆☆☆☆